بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گذشتہ ترجمان القرآن میں ہم نے بتایا تھا کہ مغرب کی ذہنی غلامی نے ہماری فکری صلاحیتوں کو اس حد تک مفلوج کر دیا ہے کہ ہم میں وقت کے تقاضوں کو بھی صحیح طور پر سمجھنے کی قوت باقی نہیں رہی۔ دنیائے مغرب اس وقت جن برائیوں میں ملوث، اور جن اخلاقی اور روحانی بیماریوں کا شکار ہے ہم نے انہیں اپنی حماقت سے وقت کے تقاضے سمجھ لیا ہے۔ اور اس بات کے درپے ہیں کہ وہ کسی طرح ہمارے معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر جائیں۔ ہماری خیرہ نگاہیں مغربی تہذیب کے مصائب کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔

فکر و نظر کا یہ انقلاب ہماری قوم کے ساتھ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ دنیا کی ہر قوم جب ذہنی اعتبار سے کسی دوسری قوم کی غلامی اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس کے اندر سب سے خوفناک بیماری یہ پرورش پاتی ہے کہ اسے اپنے آپ پر، اپنے افکار و نظریات پر، اپنی روایات پر قطعاً اعتماد نہیں رہتا۔ اس کے پاس برے اور بھلے کے درمیان تمیز کرنے کے لئے اپنا کوئی معیار نہیں ہوتا اور وہ زندگی کے سارے معاملات کو دوسروں کی فراہم کردہ عینک سے دیکھتی ہے۔ فلسفہ تاریخ کے مشہور مفکر ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "مقدمہ" میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> یہ چیز انسانی فطرت میں داخل ہے کہ جو قوم کسی دوسری قوم کو فتح کر لیتی ہے وہ صرف اس کے ملک کو ہی سرنگوں نہیں کرتی بلکہ اس کی نظروں کو بھی مفتوح کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ مغلوب قوم کے دل و دماغ میں یہ خیال راسخ ہو جاتا ہے کہ غالب قوم کا غلبہ

اُس کے بلند پایہ کمالات کی وجہ سے ہے۔ اس لئے وہ اپنی حیات کے ہر شعبے میں اُس کی نقل اُتارنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس فعل و عمل کو ہم اقتداء سے تعبیر کرتے ہیں ...... مغلوب قوم لباس، پوشاک، ساز و سامان اور زندگی کے سارے شعبوں میں اس امر کے لئے کوشاں رہتی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے آپ کو حاکم قوم کے رنگ میں رنگ لے۔ چنانچہ آج ہمارے زمانہ میں اہلِ اندلس جلالقہ سے لباس، وضع قطع اور دوسری عادات میں گہری مشابہت پیدا کر رہے ہیں اور اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ مکانوں اور کارخانوں میں زینت و آرائش کے لئے جو تصاویر اور نقش و نگار بنائے جا رہے ہیں اُن میں بھی ان حاکموں کی پوری پوری نقالی کی گئی ہے اور جو شخص بھی ذرا گہری نظر سے ان کا مطالعہ کرے گا تو اُسے فوراً معلوم ہو جائیگا یہ سب بالادست قوم کے استیلاء و غلبہ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔[1]

ابنِ خلدون نے اقتداء کی اس بحث کے ضمن میں آگے چل کر اس حقیقت کی بھی وضاحت کی ہے کہ محکوم قوم حاکم قوم کی خوبیوں کی پیروی نہیں کرتی بلکہ اُس کی بُرائیوں کو اپنے اندر رواج دینے کے لئے کوشاں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کی ذہنی غلامی اختیار کر لیتی ہے تو اُس کے اندر سے ساری تخلیقی اور تعمیری قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اُس کے اندر یہ طاقت نہیں رہتی کہ وہ ایک ترقی پذیر اور باصلاحیت قوم کی خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کر سکے، اُس کی نگاہ ہر پھر کر اُس کے اُن پہلوؤں پر پڑتی ہے جن کو اختیار کرنے میں اُسے کچھ محنت نہ کرنی پڑے اس لئے وہ صرف اس کے عیش و عشرت کے انداز کو ہی اپنانے پر اکتفا کرتی اور حاکم قوم کی زندگی کے وہ شعبے جو اُس کی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کے ترجمان ہوتے ہیں اُس کی نظروں سے یکسر اوجھل رہتے ہیں۔ کسی قوم کا دوسری قوم کی ذہنی غلامی پر رضا مند ہو جانا اس بات کی بدیہی شہادت ہے کہ اُس کے اندر بڑھنے، ترقی کرنے اور اپنی قوتوں کو ایک راہ پر لگانے کا جذبہ بالکل مفقود ہو چکا ہے۔ اگر یہ

---

[1] مقدمہ ابنِ خلدون۔ ص ۱۴۷۔

بات نہ ہوتی تو اُسے ذلت وخواری کی زندگی اختیار کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ تعمیری صلاحیتوں کے ساتھ کوئی قوم ذہنی غلامی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتی۔ ان صلاحیتوں کا وجود ایک ناقابلِ تسخیر قوت اور ایک نہ مٹنے والا جذبہ اور زندہ احساس کی علامت ہے۔ جب کسی قوم میں یہ خوبیاں موجود ہوں تو اُس کے اندر اس بات کے لئے فطری اُمنگ پیدا ہوتی ہے کہ وہ دُنیا کی دوسری اقوام پر فوقیت حاصل کرے۔ وہ جن افکار و نظریات پر ایمان رکھتی ہے دوسروں کو بھی انہیں قبول کرنے پر آمادہ کرے۔ اور زندگی کا جو نہج اُس نے اختیار کیا ہے دوسروں کو بھی اُسے اپنانے کی تلقین کرے۔ وہ صرف اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل ہی کو سربلند دیکھنا چاہتی ہے اور انہیں کے لئے جیتی اور انہیں کے لئے مرتی ہے۔ ظاہر بات ہے جس قوم کے اپنے افکار کے بارے میں یہ احساسات ہوں وہ فکری اور ذہنی اعتبار سے کسی دوسری قوم کی قیادت و رہنمائی قبول نہیں کرسکتی۔ ذلت آمیز موقف تو وہی قومیں اختیار کرتی ہیں جن کے اندر تعمیر کی ساری قوتیں سلب ہوچکی ہوں۔ اس لئے وہ غالب قوم کی صرف بُرائیاں ہی اپناتی ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنانے میں کوئی محنت و قوت صرف نہیں ہوتی۔ باقی رہیں حاکم قوم کی خوبیاں تو انہیں اختیار کرنے کی نہ تو محکوم قوم میں قوت ہوتی ہے اور نہ ولولہ اور آرزومندی۔

آپ اگر اُمتِ مُسلمہ کے حالات کا جائزہ لیں تو آپ کو اس دعوے کی صداقت پوری طرح معلوم ہوجائے گی۔ گزشتہ سو سال کے عرصہ میں ہم نے پوری محنت اور جدوجہد کے بعد آخر اہلِ یورپ کی کونسی خوبی اپنائی ہے۔ کیا ہم نے امورِ مملکت کے انتظام و انصرام میں اُن جیسی استعداد کار پیدا کی ہے؟ کیا ہم نے دیانت اور امانت کا وہ معیار قائم کرنے کی کوشش کی ہے، جو انہوں نے صنعت و تجارت میں قائم کر رکھا ہے؟ کیا ہم نے اپنے اندر نظم و ضبط کی وہ صلاحیتیں پیدا کی ہیں جو اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا طغرۂ امتیاز ہیں؟ کیا علم و تحقیق کے میدان میں ہم اُن جیسی مشقت اُٹھا رہے ہیں۔ کیا اپنے دین کی اشاعت کے معاملے میں ہم میں وہ سوزمندی اور تڑپ موجود ہے جو اُن کے ہاں دکھاتی دیتی ہے؟ کیا ہمارے ہاں بھی عدل و انصاف، راستبازی، شجاعت اور جُرأت کے نمونے اسی تعداد میں ملتے

ہیں جتنے کہ اُن کے ہاں دکھائی دیتے ہیں؟ کیا قوم اور ملک یا مفادِ عامہ کے لئے ہم میں ایثار کا وہی جذبہ کار فرما ہے۔ جو اُن کے ہاں زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے؟ آپ اس نقطہ نظر سے جب حالات کا جائزہ لیں گے تو آپ کو سخت مایوسی ہو گی۔ انسانیت کی ان اعلیٰ اور ارفع صفات میں سے کوئی صفت بھی ایسی نہیں جو ہم نے اپنے اندر پیدا کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان صفات کو معاشرے کے اندر ترقی دینے کے لئے سخت قسم کی ریاضت درکار ہے، ان کی ترویج و اشاعت جانی اور مالی ایثار، خواہشات اور تمناؤں کی قربانی کی طالب ہے، ان کو فروغ دینے کے لئے نفس کی بہت سی لذتوں سے دست کش ہونا پڑتا ہے اور یہ اس قسم کی آزمائشیں ہیں جن میں سے کوئی فرد یا قوم یونہی ہنسی خوشی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ان میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ قوم کا ہر فرد کسی بلند و بالا مقصد کی محبت میں سرشار ہو اور اس کے حصول کے لئے ہر قسم کا ایثار کرنے کے لئے عزم بالجزم رکھتا ہو۔ ظاہر بات ہے کہ یہ جذبہ کسی ایسی قوم میں کبھی پرورش نہیں پا سکتا جس نے خود اعتمادی جیسی نعمت کو کھو دیا ہو، جسے اپنے آپ، افکار و نظریات پر کسی قسم کا کوئی بھروسہ نہ رہا ہو، جس کی غور و فکر کی قوتیں شل ہو چکی ہوں اور جس نے خود اپنے جذبات و احساسات کو افسردہ بنا دیا ہو۔ اس قسم کی شکست خوردہ قوم میں یہ ہمت ہی پیدا نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی دنیا الگ تعمیر کرنے کی کوشش کرے۔ تعمیری کام ہمیشہ تعمیری صلاحیتوں اور صحت مند احساسات کا تقاضا کرتا ہے اور یہ صفات کسی ایسی قوم میں پرورش نہیں پا سکتی، جس نے دوسری قوموں کی نقالی کو اپنا شعار بنا لیا ہو۔ محکوم قوم اپنے عافیت پسندانہ مزاج، اپنی غلامانہ ذہنیت اور اپنی ہوس پرستانہ طبیعت کی وجہ سے غالب تہذیب کے صرف انہیں پہلوؤں کی نقالی کرے گی جن میں اُسے کسی قسم کی محنت یا ایثار نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ دیکھئے کہ آج ہمارے ہاں اہلِ مغرب کے جن شعار کو ایک دوسرے سے بڑھکر اپنانے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ قریب قریب وہی ہیں جن میں خیر سے زیادہ شر کا پہلو نمایاں ہے۔ ہمارے ہاں سارا زور مرد و زن کے آزادانہ میل جول، ضبطِ تولید، ناچ گانے کی مخلوط مجالس کے اہتمام پر صرف ہو رہا ہے۔ باقی رہے وہ شعبے جن میں عقل و فکر، تدبر و تفکر، ایثار اور قربانی درکار ہے تو اُن میں ہماری طبیعتیں تقلیدِ مغرب پر کبھی آمادہ نہیں ہونے

پاتی ہیں، اور وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اس سنگلاخ اور دشوار گذار راستہ سے فرار کی کوشش کرتی ہیں۔

ہمارا یہ عافیت پسندانہ طرزِ عمل یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے لیکن اس وقت ہم صرف اس کے ایک پہلو کا ذکر کریں گے۔

جن حضرات نے اقتدار کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اقتدار اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑا احساس اور جذباتی ہوتا ہے۔ وہ کبھی اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا کہ اُس پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد کی جائے یا اُس کے فیصلوں کے خلاف کسی طرف سے کوئی اُنگلی اُٹھے۔ اس بنا پر اُسے جب کبھی بھی موقع ملا تو اُس نے سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی کہ وہ اپنے دائرہ اختیار کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرے تاکہ کوئی اُس کے راستے میں مزاحم نہ ہوسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس نے اس بات کا بھی پورا پورا التزام کیا کہ وہ اس اقتدار کو اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ محفوظ کرے اور عوام مسندِ اقتدار کو اُس کی جائز میراث سمجھتے ہوئے اُس کی طرف کبھی ہاتھ بڑھانے کی جرأت نہ کریں۔ اس کے علاوہ ہمیشہ اس بات کے لئے بھی کوشاں رہا کہ وہ اُن آوازوں کو سختی کے ساتھ دبا دے جن میں اُس کی مدح و ستائش کے علاوہ حقیقت کی تلخی کا بھی کوئی جزو شامل ہو۔ کیونکہ اُس کے کان کسی ناگوار بات کو سننے کے متحمل ہی نہیں ہوتے۔

ایک طرف اصحابِ اقتدار کا اقتدار کے معاملہ میں یہ طرزِ عمل رہا ہے تو دوسری طرف جن لوگوں نے کسی معاشرے میں حیوان بن کر نہیں بلکہ انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا عزم کیا، انہوں نے انسانی حقوق کی جان پر کھیل کر بھی حفاظت و پاسبانی کی۔ انہوں نے بڑے بڑے جباروں اور قہاروں کو اُن کی غلط روی پر برملا ٹوکا اور اُن کے انسانیت سوز عزائم کا پوری قوت سے راستہ روکنے کی سعی کی۔ اس راہ میں نہ تو ظالموں کا ظلم و استبداد اُن کے ارادوں کو شکست دے سکا اور نہ ہی عیار اور

چالاک ارباب اقتدار کی چالبازیاں انہیں خاموش کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ انہیں نے ہر قسم کے مصائب برداشت کئے لیکن وہ اپنے انسانی حقوق سے دستبردار ہونے پر کبھی آمادہ نہ ہوئے۔ ارباب اقتدار اور حقوقِ انسانیت کے پاسبانوں کے درمیان یہ کشمکش اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ مدنی الطبع انسان کی سرگزشت۔

تاریخ انسانی میں حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے پاکباز خلفاء کا دور ایک ایسا سعید دور ہے جس میں اقتدار کے مسئلہ کو بالکل عدل وانصاف کے ساتھ حل کر دیا گیا۔ حضور نے سب سے پہلے تو اس باطل خیال کی تردید کی کہ دنیا میں کوئی شخص یا ادارہ غیر مسئول اقتدار کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ اسلام میں چونکہ حاکمیت خالقِ کائنات کی ہے اس لئے کوئی فرد یا گروہ بھی من مانی کارروائیاں کرنے کا مجاز نہیں۔ خداوند تعالیٰ نے جو حقوق انسانوں کو دے رکھے ہیں، انہیں کوئی فرد بھی اپنے ذاتی منشا اور مرضی سے سلب نہیں کر سکتا۔ ان سے صرف احکام الٰہی کے مطابق ہی کسی کو محروم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا خدا اور اُس کے رسول کے فیصلوں کی غیر مشروط اطاعت کا حلف اقتدار پر وہ سب سے بڑی پابندی ہے جو اسلام نے عائد کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کا بارِ گراں اُٹھانے کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ ارشاد فرمایا اُس میں اس حلف کی پوری تصریح موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور درود وسلام کے بعد فرمایا:

ایھا الناس فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان أحسنت فاعینونی و ان اساءت فقومونی الصدقُ امانةٌ والکذب خیانةٌ والضعیف منکم قوی عندی حتیٰ أزیح علته انشاء اللہ والقوی فیکم ضعیف حتیٰ آخذ	اے لوگو! مجھے تمہاری امارت سونپی گئی ہے حالانکہ میں تم سے بہتر اور افضل نہیں ہوں۔ پس اگر میں صحیح کام کروں تو تم میری دستگیری کرو اور اگر کوئی غلط اقدام کروں تو مجھے راہِ راست پر لاؤ۔ سچائی ایک امانت ہے اور کذب خیانت ہے۔ تم میں سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ میں اُس کی شکایت کا

منہ الحق ان شاء اللہ لا یدع قوم الجہاد فی سبیل اللہ الا ضربہم اللہ بالذل ولا یشیع قوم قط الفاحشۃ الا عمہم اللہ بالبلاء اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم۔ قوموا الی صلوتکم رحمکم اللہ

(البدایۃ والنہایۃ جلد ج ص ۲۴۸)

ازالہ نہ کردوں۔ اور تم میں سے جو قوی ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے جب تک کہ میں اُس سے حق نہ لے لوں۔ جو قوم جہاد سے دست کش ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ اُن پر ذلت طاری کر دیتا ہے اور جس قوم میں فاحش باتیں عام ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ اُسے مصائب میں گرفتار کر دیتا ہے۔ جب تک کہ میں اللہ اور اس کے رسول کا اطاعت گذار رہوں تم میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ اور اُس کے رسول سے روگردانی کروں تو تم میری اطاعت سے آزاد ہو۔ اچھا اب نماز کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔

اس بلیغانہ خطبہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُن ساری پابندیوں کا ذکر فرما دیا ہے جو اسلام نے اقتدار پر عائد کی ہیں۔ تاکہ وہ غلط راہ پر پڑ کر لوگوں کے لئے مصیبت اور پریشانی کا باعث نہ بنے۔ اس میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں اقتدار کبھی غیر مسئول نہیں ہوتا۔ برسر اقتدار لوگوں کی اطاعت اُسی وقت تک فرض ہوتی ہے جب تک کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے مطیع اور فرمانبردار رہیں اور اگر وہ اللہ اور اُس کے رسول کی غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں سے اُتار دیں۔ تو پھر وہ رعایا سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کرنے کے مجاز نہیں ہوتے۔ دوسرے اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ کیا حکمران خدا اور اُس کے رسول کے احکام کی دل و جان سے پابندی کر رہے ہیں۔ اسلام نے عوام کو اس بات کا پورا اختیار دیا ہے کہ وہ برسر اقتدار گروہ کی نہ صرف پبلک لائف بلکہ پرائیویٹ لائف پر بھی مواخذہ اور احتساب کریں اور کوئی شخص بھی انہیں اپنے اس حق سے محروم نہیں کر سکتا چنانچہ مسلمان حکمران سلطنت کے اہم امور سے لے کر اپنی زندگی کے معمولی سے معمولی معاملات تک خدا اور خلق دونوں کے سامنے جوابدہ ہیں اور خلافتِ راشدہ کے عہد میں تو اس امر کا پورا التزام کیا جاتا تھا کہ رعایا کے اندر احتساب

کا جذبہ افسردہ نہ ہونے پائے۔ ایک موقع پر ایک شخص نے کئی بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے کہا کہ اتق اللہ یا عمرؓ یعنی "اے عمر خدا سے ڈر" حاضرین میں سے ایک شخص نے اس کو اس سے باز رکھنا چاہا اور کہا کہ بس بہت ہوا۔ حضرت عمر نے فرمایا، نہیں انہیں کہنے دو۔ اگر یہ لوگ نہ کہیں تو بے مصرف ہیں اور اگر ہم لوگ نہ مانیں تو ہم بیکار ہیں۔ ایک مرتبہ خلیفہ ثانیؓ نے رعایا کے حقوق و فرائض کی تشریح کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے :

"اور تم میرے نفس کے مقابلے میں میری مدد اسی طرح کر سکتے ہو کہ مجھے بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو، نیز خدا نے تمہاری جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔ اس کے بارے میں میری خیر خواہی (نصیحت) کرتے رہو۔

خلفائے راشدین احتساب کے اس جذبہ کو زندہ رکھنے کے کتنے آرزومند تھے اُس کا اندازہ وہی لوگ پوری طرح کر سکتے ہیں جنہوں نے اُس بابرکت دور کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ آدمی پر صرف اپنے اعمال کی ذمہ داری ہے۔ معاشرے میں جو کچھ ہوتا ہے اُس کے متعلق اُس سے کوئی باز پُرس اور مواخذہ نہ ہوگا۔ یہ لوگ قرآن مجید کی اُس آیت سے استدلال کرتے تھے کہ یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا عَلَیْکُمْ أَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَیْتُمْ۔ (اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو بچاؤ، جو لوگ گمراہ ہیں ان کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی جب کہ تم خود ہدایت پر ہو) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب اس صورتِ حال کا علم ہوا تو انہیں سخت فکر لاحق ہوئی اور خیال کیا کہ اگر یہ احساس افسردہ پڑ گیا تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وہ روح ہی لوگوں کے اندر مُردہ ہو جائے گی جس کے بغیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام کا اپنی صحیح اور صحت مند حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے فوراً اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے لوگوں کے سامنے تقریر فرمائی۔

اے لوگو تم اس آیت کا حوالہ دیتے ہو یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا عَلَیْکُمْ أَنْفُسَکُمْ۔ اور ہم نے

قاضی ابو یوسف کتاب الخراج ص ۷۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپ فرماتے تھے:

لوگ جب بُرائی دیکھتے ہیں اور اس کی اصلاح نہیں کرتے تو ممکن ہے کہ اُس کے سبب سے جو عذاب آئے وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے بعض نہایت ہی حکیمانہ تدابیر کے ذریعہ مثلاً اقتدار کو احکام الٰہی اور سنت نبوی کا پابند بنا کر، اور عوام کی اطاعت کو اس پابندی سے وابستہ رکھ کر، لوگوں کو اظہار رائے کی آزادی دے کر اور اُن کے اندر احتساب کے جذبہ کی صحیح طور پر نشو ونما کر کے، عدلیہ کو انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد رکھ کر، اقتدار کو ظلم کا آلہ کار بننے کی بجائے اُسے نوعِ انسانی کی فلاح وبہبود کا ایک مؤثر ذریعہ بنایا ہے۔

اسلام کی بعض دوسری اقدار کی طرح اقتدار کے معاملے میں بھی بہت سی غیر مُسلم اقوام نے اسلامی تعلیمات کو کسی حد تک اپنانے کی کوشش کی ہے۔ صدیوں کے تلخ تجربات نے ان کے اندر بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس پیدا کیا کہ بپھرا ہوا اقتدار کسی قوم اور ملک کے لئے مفید اور کار آمد ثابت نہیں ہو سکتا اگر وقتی ہیجان اور جوش میں اس سے کوئی فائدہ بھی حاصل ہو جائے تو اس کے نتائج دیر پا نہیں ہوتے اور یہ اقتدار جلد ہی بے لگام ہو کر اُن راہوں پر چل نکلتا ہے جو کسی قوم کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جاتی ہیں۔ اُنہوں نے اس سلسلہ میں پہلا سبق یہ سیکھا ہے کہ اگر لوگوں کو اپنے خیالات اور احساسات کے اظہار کی آزادی حاصل نہ ہو گی تو پھر ملک کے اندر خفیہ تحریکیں زیر زمین نہایت ہی خوفناک سازشوں کا جال بچھا دیں گی۔ کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ اندوہناک صورتِ حال اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ اقتدار جسے محض قوت وطاقت کے بل بوتے پر عوام پر مسلط کیا جائے اور لوگوں کے دل ودماغ اُسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں وہ قوم کے اندر قنوطیت اور احساسِ شکست پیدا کرتا ہے جو اُس کے لئے موت کا پیغام ہے۔ قانون کے ذریعہ لوگوں کی زبانوں پر پہرے بٹھائے جا سکتے ہیں لیکن آج تک نوع بشری کوئی ایسا مؤثر اور ہمہ گیر قانون نہیں بنا سکی

جو خیالات واحساسات کے ایوانوں کو مقفل کرنے میں کامیاب ثابت ہوا ہو۔ جبر واستبداد کا نتیجہ لازمی طور پر یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر نفرت کے جذبات بڑی سُرعت کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد جب یہ لاوا پھٹتا ہے تو اس سے قومی زندگی کے سارے شعبے زیر وزبر ہونے شروع ہوتے ہیں اور ایک ایسا خوفناک زلزلہ آتا ہے کہ وہ قوم صدیوں تک سنبھلنے نہیں پاتی۔

آپ دُنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو اس بات کی صحت خود بخود معلوم ہو جائے گی۔ انگلستان جسے آج جمہوریت کا گہوارہ کہا جاتا ہے چار صدیاں پیشتر تک سازشوں اور بغاوتوں '' مرکز تھا۔ یہاں آئے دن طوفان اُٹھتے رہتے تھے اور وہاں کے باشندوں کی زندگی میں ہر وقت تلاطم پیدا ہوتا رہتا تھا۔ لیکن اس ملک نے جس روز سے اس حقیقت کو پہچان لیا ہے کہ جبر واستبداد سے رائے عامہ کو ہموار نہیں کیا جا سکتا اُسی دن سے اُن کی زندگی میں ایک سکون اور قرار پیدا ہو گیا ہے۔ وہاں جس وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے حالات کے تقاضوں کے تحت اقتدار میں مناسب تغیر و تبدل کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اُن کے اندر کوئی بغاوت اور شورش نہیں اُٹھنے پاتی۔ اُس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہاں کے حکمران طبقے تیر و تفنگ سے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کی بجائے اُن کے دلوں کو مفتوح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عوام جو بات اُن سے کہتے ہیں وہ اس پر مشتعل ہونے اور اُنہیں دردناک عذاب کی وعید سُنانے کی بجائے اُسے بڑے تحمل اور سکون کے ساتھ سنتے ہیں اور پھر اُسے جذبات کے شعلوں میں جلانے کی بجائے اُسے فہم و فراست کی معتدل میزان میں تول کر دیکھتے ہیں کہ اس میں ملک اور قوم کا کیا فائدہ اور کیا نقصان ہے اور پھر اپنی بات جوتے کے زور سے منوانے کی بجائے اُسے دلائل کے زور سے منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انگلستان کے مقابلے میں جب ہم دُنیائے اسلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کسی آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر تعمیر کی گئی ہے آج اس ملک سے انقلاب کی خبر آرہی

ہے تو کل دوسرے ملک سے بغاوت کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں عوام کے مختلف طبقات ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں اور کہیں رعایا اور شہنشاہ ایک دوسرے سے دست و گریباں۔ صبح ایک گروہ مسندِ اقتدار پر متمکن ہے تو شام کو دوسرا گروہ اُس پر قابض نظر آتا ہے۔ اس سرپھٹول میں مسلمانوں کی جتنی قیمتی جانیں ضائع ہوئی ہیں، اُن کے وقت اور مال کا جس قدر زیاں ہُوا ہے اُس کے تصور ہی سے جسم کانپ اُٹھتا ہے۔ اس بربادی کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہمارے ہاں جو فرد یا گروہ بھی برسرِ اقتدار آتا ہے وہ رائے عامہ کا اعتماد حاصل کرنے کی بجائے ایسی تدبیریں سوچنے میں منہمک ہو جاتا ہے جس سے اُس کے اقتدار کی عمر زیادہ سے زیادہ لمبی ہو سکے۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے جوڑ توڑ کرتا ہے، ملک کے مضبوط اور طاقتور لوگوں کو سیاسی رشوتیں دیتا ہے، اُنہیں عہدے کے لالچ سے خریدنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جما کر لوگوں کو مرعوب کرنے کی مختلف راہیں نکالتا ہے۔ آج ترکی، ایران، مصر، عراق، افغانستان میں جو واقعات رونما ہو رہے ہیں کیا وہ اس افسوسناک صورتِ حال کی شہادت فراہم نہیں کرتے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے پوری دُنیائے اسلام صرف شورش پسندوں سے ہی بھر گئی ہے۔ جو یونان کے روایتی دیوتاؤں کی طرح تباہی و بربادی ہی میں لذّت و راحت محسوس کرتے ہیں، اور سکون و طمانیت سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اقتدار کو اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر نہیں سمجھتے اس لئے وہ اُس سے نجات حاصل کرنے کے لئے برابر جدوجہد کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اُمتِ مسلمہ پر اگرچہ انحطاط طاری ہے لیکن اُس کے دماغ میں ابھی اتنا فتور پیدا نہیں ہُوا کہ وہ اپنے آپ کو نیست و نابود کرنے پر ہی مصر ہو۔

اس غیر مسئول اقتدار سے صرف دُنیائے اسلام کو ہی پے درپے نقصان نہیں پہنچ رہا بلکہ دورِ جدید میں اس سے بعض بڑی عظیم الشان قومیں تباہ ہوئی ہیں۔ جرمنی جیسی بہادر اور جری قوم کی بربادی کا سبب یہی غیر مسئول اقتدار ہی تو تھا۔ ہٹلر کو اپنی آمرانہ حیثیت قائم رکھنے کے لئے اہلِ جرمن کے جذبات کو اس حد تک مشتعل کرنا پڑا کہ ملک کی پوری فضا شعلہ جوالہ بن کر رہ گئی۔ قوم نے اپنے داخلی اور

خارجی مسائل پر عقل وفکر سے غور کرنے کی بجائے جذبات کی شعلہ فشانیوں سے حل کرنے کی کوشش کی۔ جذبات کے اس طرح بے لگام ہونے سے ایک وقتی جوش تو ضرور پیدا ہو گیا لیکن اس سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ آج پوری نوعِ انسانی کے سامنے ہیں۔ یہ مہتم بالشان قوم جس نے چند دنوں کے اندر پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے۔ یہ معاملہ کسی ایک قوم یا عہد کے ساتھ مخصوص نہیں دُنیا کے جس ملک کے اندر بھی اقتدار غیر مسئول ہو گا وہ مقدس تمناؤں کے باوجود بے راہ رَو ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کسی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

یورپ کی کئی قومیں ایسی ہیں جنہوں نے غیر مسئول اقتدار کی ریشہ دوانیوں کو دیکھ کر اسے آئین و ضوابط کا پابند کرنے کی بڑی کامیاب کوششیں کیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ میں اس مسئلہ کو جس خوبی کے ساتھ حل کیا گیا ہے اُس کی نظیر دُنیا پرست قوموں میں بہت کم ملتی ہے۔ انگلستان میں اقتدار گو تعلیمات الٰہی کا پابند نہیں لیکن وہ اتنا بے لگام بھی نہیں کہ قوم کی خواہشات کو جس طرح چاہے روندتا رہے۔ اُس پر بعض بڑی کڑی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ وہ ملک کے دستور کا پابند ہے۔ پھر اس قوم کی بعض ایسی روایات ہیں جن کا اُسے ہر حال میں احترام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ہر قول اور فعل کے لئے اپنے آپ کو قوم کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے۔ ایک مضبوط عدلیہ جو اُس کے دباؤ سے یکسر آزاد ہے اُس سے اس کی کارگذاریوں کے بارے میں فیصلہ طلب کیا جا سکتا ہے اور اُس فیصلے کا اس پر براہِ راست اثر پڑتا ہے اور سب سے بڑھ کر اس قوم کا اقتدار ہر لمحہ رائے عامہ کی تائید کا محتاج ہے۔ وہ اس سے بے نیاز ہو کر ایک قدم بھی اُٹھانے کی جُرأت نہیں رکھتا۔ ان پابندیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم کے فکری جہاز بے لنگر نہیں ہوتے۔ وہ سخت طوفانوں میں گھِر کر بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس قوم کو گذشتہ چند سالوں سے جن مصائب و شدائد کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ اگر کسی ایسی قوم کو درپیش ہوتے جہاں اقتدار کو عوام کی دلی تائید حاصل نہ ہوتی، تو وہ قوم بیرونی دشمنوں کے حملوں سے کہیں پہلے اندرونی

خلفشار میں مبتلا ہو کر برباد ہو چکی ہوتی۔

اقتدار پر جائز اور مناسب قسم کی پابندیاں لگا کر اس کی قوت و طاقت کو قوم کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنا وقت کا ایک نہایت ہی اہم تقاضا ہے جس سے امتِ مسلمہ ایک لمحہ کیلئے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتی۔ مگر ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ملتِ بیضا کے سربراہ جنہیں آرٹ اور کلچر کی معمولی سے معمولی جزئیات کے معاملے میں وقت کے تقاضوں کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے وہ اس بڑے تقاضے کو آخر کیوں سمجھ نہیں پاتے۔ اور انہیں اگر اس کی طرف توجہ بھی دلائی جاتی ہے تو وہ یہ کہہ کر اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ محض تعیش ہے جس کی ہماری قوم متحمل نہیں ہو سکتی۔ رموزِ مملکت خسرواں دانند۔ لیکن ہم جیسے عام شہریوں کے دل میں یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ کیا ہمارے ملکی خزانے اُن ساری عیاشیوں کے پوری طرح متحمل ہیں جنہیں یہاں پھیلانے کے لئے سر توڑ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ کیا یہ عیش پرستیاں ہی ہمارے لئے وقت کے تقاضے ہیں اور وہ سارے کام جن سے ہماری اجتماعی زندگی کی تعمیر ہو سکتی ہے وہ ہمارے لئے شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فکر و نظر کا یہ تضاد آپ کو پوری دنیائے اسلام میں ملے گا۔ ٹرکی جس نے مغرب کی تقلید میں اپنی اجتماعی زندگی سے اسلام کو خارج کیا، جس نے عفت مآب بیٹیوں کو گھروں سے نکال کر فوج اور کارخانوں میں بھرتی کیا، اُن کے چہروں سے قوت و طاقت کے ساتھ نقاب نوچے۔ اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے اندر مغربی عورتوں کی سی آزادی اور روشن خیالی پیدا کریں، جس نے ترکوں کو لباس، وضع قطع تبدیل کرنے کی سختی کے ساتھ تلقین کی، جس نے اُن کے نام بدلے، اُن کے صدیوں کے پرانے رسم الخط کو بدل کر اس بات کا التزام کیا کہ اُن کا اپنے ماضی سے رشتہ بالکل منقطع ہو جائے اور وہ ہر لحاظ سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ جائیں۔ وہاں بھی جب نظامِ مملکت کی تشکیل کا سوال آیا

تو اس معاملے میں مغرب کی جمہوری اقدار کو بالکل بالائے رکھ کر ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی گئی، جس نے آج تک ترکوں کی قوت کو ایک مرکز پر جمع نہیں ہونے دیا۔ اتاترک اور اُس کے جاں نثار فدائی عصمت انونو جو اہلِ مغرب کی ہر ادا پر جان نثار کرتے ہیں، اُن کی تہذیب کو انسانیت کی معراج تصوّر کرتے ہیں، اور اُسے اپنے ملک کے ہاں رائج کرنے اور ترقی دینے کے انتہائی آرزومند ہیں اُ ؎ کے سامنے جب اقتدار کا مسئلہ آتا ہے تو وہ اپنے پیشوا کی ساری تعلیمات کو پسِ پشت ڈال کر اُسے ایسے انداز سے طے کرتے ہیں جو انتہائی شرمناک ہے۔ یہی صورتِ حال مصر، انڈونیشیا، شام، عراق اور دوسرے اسلامی ممالک میں نظر آتی ہے۔ اس موقع پر ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اس امت کے اندر اُن برائیوں کو تو پھیلانے کی پوری کوشش کی جاتی ہے جو اُس کے مزاج سے ذرّہ برابر مناسبت نہیں رکھتیں اور ان کے برعکس اسے جمہوریت کی اُن اقدار سے محروم کیا جاتا ہے جن سے اُس کی فطرت کا خمیر اُٹھایا گیا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کا ذکر ہم نے آغاز میں کیا ہے۔ جب ایک قوم کسی طاقتور قوم کی ذہنی غلامی میں گرفتار ہو کر اُس کی نقالی کرتی ہے تو وہ صرف اُس کے کمزور پہلوؤں کو ہی اپناتی ہے اور اُس کی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے کی ہمت و طاقت نہیں رکھتی۔

برسرِاقتدار گروہ کے لئے یہ کام تو بالکل آسان ہے کہ وہ اس رو بہ انحطاط قوم کو جسے غلامی نے عیش و آرام کا خوگر بنا دیا ہے مختلف تدابیر سے مزید عیش پرست بنا دے لیکن اُس کی سہل پسند طبیعت اپنے آپ کو اس بات کے لئے آمادہ نہیں پاتی کہ وہ رائے عامہ کی تربیت کا انتظام کرے۔ وہ اس راہ کی مشکلات کو بخوبی جانتا ہے اور اس کے لئے جس قسم کا ایثار اور محنت درکار ہے وہ اُس سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ کسی ملک یا قوم میں جمہوری روایات صرف اُسی وقت صحیح طور پر نشوونما پاتی ہیں جب سب سے پہلے برسرِاقتدار گروہ اُن کی پوری پوری پابندی کرے۔ وہ اپنے آپ کو ایسے دستور کا پابند بنائے جو اس ملک کے عوام کی خواہشات کا ترجمان ہو، پھر اس

دستور کے مطابق قوم کی تعمیر و ترقی کے لئے جد و جہد کرے اور ہر گام پر پوری قوم کو اپنے اعتماد میں لینے کے لئے کوشاں رہے۔ وہ اپنے آپ کو عوام کے سامنے جواب دہ سمجھے اور انسانوں میں انسان بن کر چلنے کے ڈھنگ سیکھے، اُن پر اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ نہ جماتا رہے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جن میں غیر معمولی حوصلہ اور ہمت و طاقت اور تدبّر ہو۔ افسوس ہے کہ مُسلم قوم کے اندر دَورِ جدید میں اس معیار کا کوئی گروہ اقتدار کے تخت پر متمکن نہیں ہؤا۔

ہماری ملّت کے اندر گذشتہ چند سالوں میں جن لوگوں کو قیادت اور سربراہی کا منصب حاصل ہؤا ہے انہیں ملّتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کا اتنا شدید احساس نہیں جتنا کہ اپنے اقتدار کے حفظ و بقا کی فکر دامنگیر ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے بعض ایسی مضحکہ خیز تدابیر اختیار کی جاتی ہیں کہ جن پر پوری دُنیا خندہ زن ہے۔ چند سال پیشتر مصر کے اندر الاخوان المسلمون کا جو حشر کیا گیا، اور حال ہی میں ٹرکی میں جو خونی ڈرامہ کھیلا گیا ہے اُس کی صاحب احساس اور فرض شناس قیادت سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ آئین کے نام پر یہ بے آئینی اور آزادی اور جمہوریت کے نام پر یہ ظلم واستبداد وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل میں نہ تو خدا کا خوف ہو اور نہ خلق کی شرم اور جنھیں اپنی بڑائی اور کبریائی دنیا کی ہر چیز سے عزیز تر ہو۔

ضروری اعلان

ماہنامہ "ترجمان القرآن" منصبِ رسالت نمبر کے پرچے دفتر میں موجود ہیں۔ جو حضرات منگوانا چاہیں وہ قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیج کر یا وی۔ پی سے منگوا سکتے ہیں۔ قیمت فی پرچہ تین روپے پچاس پیسے ہے۔ محصول ڈاک اس کے علاوہ ہوگا۔ ایجنٹ حضرات کو حسب سابق کمیشن دیا جائے گا۔

منیجر "ترجمان القرآن" لاہور